Oriental College Magazine, Vol.102, No. 03, Serial No. 385, 2026

سفر نامہ "میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان" (صہبا لکھنوی) اور "لکشمن ریکھا کے پار" (الیاس احمد گدی) کا تقابلی مطالعہ

شمع فردوس

ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی اردو، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

رحمان سرور باجوہ، پی ایچ ڈی

لیکچرار، شعبۂ اردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

A Comparative Study of the Travelogues "Mere Khwabon Ki Sarzameen: Mashriqi Pakistan (Sahba Lucknowi)" and "Lakshman Rekha Ke Paar (Ilyas Ahmed Gaddi)"

Shama Firdous
PhD Scholare (Urdu)
The Islamia University of Bahawalpur

Rehman Sarwar Bajwa, PhD
Lecturer, Department of Urdu and Iqbaliat
The Islamia University of Bahawalpur

Abstract

The purpose of writing a travelogue is not merely to explore a land; it also entails documenting its political and social history alongside its geographical and historical significance. The tragedy of East Pakistan carries profound political, social, and historical implications. Just as these repercussions have influenced other genres of Urdu literature, they have also impacted the genre of the travelogue. To examine these effects, two travelogues have been selected for this study. The analysis aims to explore how the tragedy of the Fall of Dhaka stirred the sensibilities of writers with differing perspectives and to identify the points of divergence—political, social, and historical—regarding this event as reflected in the two chosen works.

Keywords:
A Comparative Study, Urdu Travelogue, Fall of Dhaka, Tragedy of East Pakistan, Urdu Literature, Sahba Lucknowi, Ilyas Ahmed Gaddi, Historical Impact, Social Impact, Political Impact.

فطری طور پر ایک انسان فرار پسند ہے۔ وہ ایک ہی ماحول میں رہ کر اس ماحول کی یکسانیت سے اکتا جاتا ہے چنانچہ وہ سامانِ تفریح کے میسر ہونے اور اور اپنی روزمرہ زندگی میں یکسانیت کے خاتمہ کے لیے کسی دوسرے مقام پر جزوقتی طور پر ایک طرح کی نقل مکانی کرتا ہے۔ جب وہ سفر سے واپس آتا ہے تو وہ خود کو تازہ دم محسوس کرتا ہے اور اپنے اس خوشگوار تجربے میں دوسروں کو بھی شامل رکھنا چاہتا ہے۔ اس بنا پر وہ سفر کے حالات و واقعات اور اس کی جزیات کو بیان کرتا ہے۔ ایک طرح سے سفر نامہ تحریر کر کے وہ اپنی خوشگوار ماضی کی بازیافت کرتا ہے۔ اپنے اس عمل کی بنا پر بعض اوقات دیکھے ہوئے مقامات بھی اس کو دوبارہ سے دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں کو دیکھنے اور وہاں کے دل فریب نظاروں کو محسوس کرنے کے لیے انسانی ذہن میں ایک جذبہ کار فرما ہونا چاہیے، جب یہ جذبہ کسی انسان کے ذہن میں بیدار ہوتا ہے تو وہ مختلف راستوں پر چل نکلتا ہے۔ یہ راستے اسے حیرت اور تحیر میں بھٹکاتے بھی ہیں اور علم و آگہی سے منور بھی کرتے ہیں۔ سفر دو طرح کے ہو سکتے ہیں: خارج اور باطن ۔ دونوں طرح کے اسفار کی اپنی اہمیت ہے۔ انسان کا باطنی سفر اسے اللہ تعالی کی وحدانیت کا عرفان دیتا ہے جبکہ انسان کا خارجی سفر محض انسان کی تہذیب و ثقافت سے ہی اسے روشناس نہیں کراتا بلکہ ماضی کی بازیافت اور مستقبل کی جھلک سے بھی ہمکنار کرتا ہے۔

سفر نامے کا شمار اردو کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ سفر نامے میں ایک سفر نامہ نگار چشم دید حالات و واقعات کو قلم بند کرتا ہے ۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اور جس مقام سے گزرتا ہے ان کے متعلق تمام جزیات کو سفر نامے میں بیان کرتا ہے۔ سفر نامہ نگاری بھی باقی اصناف کی مانند ایک تخلیقی تجربہ ہوتا ہے۔ سفر نامے میں محض حالات و واقعات اور یاداشتیں ہی قلم بند نہیں ہوتی بلکہ جیتی جاگتی متحرک تصاویر قاری کو دیکھنے یا محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مختلف ماہرین نے سفر نامے کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں ۔ ڈاکٹر انور سدید کے نزدیک:

> "سفر نامہ سفر کے تاثرات حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔" (۱)

ڈاکٹر سید عبد اللہ سفر نامے کے متعلق لکھتے ہیں:

"سفر نامہ نگاری ایک طرح کی مرقع نگاری ہے جس میں بیانیہ، وصفیہ اور تاثریہ جزیات ایک خاص ہنر اور سلیقہ و تناسب سے مرتب ہوتے ہیں۔" (۲)

مولانا شبلی نعمانی سفر نامہ روم مصر و شام میں سفر نامہ کو منفرد نگاہ سے دیکھتے ہیں:

"سفر نامہ اگرچہ تاریخی سلسلے کا ایک دلچسپ حصہ ہے لیکن جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر غلطیوں کے احتمالات سے مملو ہے۔" (۳)

ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے سفر نامے کی تعریف یوں کی ہے:

"سفر نامے کے معنی داستان سفر، روداد سفر یا سفر کے قصے کے ہیں جسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو۔ انگریزی میں ایسے سفر کو بیان کرنے والی متحرک تصاویر یا مصورِ تقریر بتایا گیا ہے۔" (۴)

ڈاکٹر خالد محمود سفر نامے کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے۔" (۵)

ماہرین کی سفر نامے سے متعلق مختلف تعریفوں سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ سفر نامہ سفر کے تاثرات، حالات اور قواعد پر مشتمل ہوتا ہے۔ عموماً سفر نامہ بیانیہ صورت میں تحریر ہوتا ہے جس میں ایک سفر نامہ نگار اپنے سفر کے دوران یا سفر مکمل کرنے کے بعد سفر سے متعلقہ مشاہدات اور کیفیات کو اپنی یادداشت اور قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔ ایک سفر کے دوران سفر نامہ نگار محض خارجی ماحول کا مشاہدہ ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی بات کو مؤثر اور مدلل بنانے کے لیے سفر کے واقعات سے ہٹ کر بھی جزیات کو قلم بند کرتا ہے۔

سقوط ڈھاکا جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایک عظیم المیہ ہے۔ پس اس المیہ نے اردو ادب کی دیگر اصناف کی مانند اردو سفر ناموں پر بھی گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ اس سانحے کے بعد سفر نامہ محض تفریح اور معلومات کا ہی ذریعہ نہیں رہا بلکہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل کر گیا ہے۔

"میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان" صہبا لکھنوی کا سفر نامہ ہے۔ صہبا لکھنوی رسالہ "افکار" کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ ابتدا میں بھوپال بعد ازاں جب وہ ہجرت کر کے کراچی آئے تو انہوں نے اس رسالے کی اشاعت اس شہر سے کرنا شروع کر دی۔ صہبا لکھنوی نے ۱۹۶۱ء میں مشرقی پاکستان کا سفر کیا

تھا۔ انہوں نے دو ہفتے مشرقی پاکستان میں قیام کیے تھے۔ سفر کے زیادہ تر حالات و واقعات مصنف نے سفر کے فوراً بعد تحریر کر لیے تھے تاہم سفر نامے کو مکمل کرنے میں انہیں دو سال کا عرصہ لگا اور ۱۹۶۳ء میں یہ سفر نامہ مکتبہ "افکار" کے پلیٹ فارم سے ہی شائع ہوا۔ مصنف کا سفر نامہ " میرے خوابوں کی سر زمین۔ مشرقی پاکستان" کو لکھنے کا ایک مخصوص محرک تھا۔ مصنف یہ سمجھتا تھا کہ مشرقی پاکستان میں بے شمار ادیبوں اور صحافیوں نے سفر کیا ہے لیکن کسی خاص ادیب یا صحافی نے مشرقی پاکستان کے ہمہ گیر مسائل اور وہاں کی مجموعی زندگی کا جائزہ پیش نہیں کیا تھا۔ چنانچہ صہبا لکھنوی صاحب نے سفر نامہ "میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان" تحریر کر کے نہ صرف مشرقی پاکستان کے لوگوں کے طرز زندگی اور ان کے دامن گیر مسائل کا ذکر کیا ہے بلکہ یہ تمام تفصیلات قلم بند کر کے انہوں نے دیگر ادیبوں کو بھی ترغیب دی ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لکھیں۔

صہبا لکھنوی نے اپنے سفر نامے کے آغاز میں ۱۹۶۱ء تک مشرقی پاکستان میں جو تعلیمی اور معاشی منصوبے مکمل ہو چکے تھے ان کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ اس جائزے میں انہوں نے بتایا ہے کہ مشرقی پاکستان میں لٹریسی ریٹ ۲۲ فیصد تھا اور یہاں پہ تین یونیورسٹیاں ۸۸ کالج اور ہزاروں کی تعداد میں سکول و مکتب عوام کو تعلیم دے رہے تھے۔ یہاں کی مشہور بندرگاہیں چٹاگام اور چالنا تھیں۔ زرعی پیداوار میں پٹ سن، چاول، تمباکو، گنا، پھل، دالیں، چائے اور پان کی فصلیں شامل تھیں۔ جبکہ صنعتی پیداوار میں ربڑ اور چمڑے کا سامان، سوتی کپڑا، ماچس اور پلاسٹک کی مصنوعات شامل تھیں۔ اہم مشہور ادبی ثقافتی اداروں میں اسلامک اکیڈمی، بنگلہ اکیڈمی، انسٹیٹیوٹ آف ارٹس، انجمن ترقی اردو۔ مشرقی پاکستان، رائٹر گلڈ، بنگلہ اردو سوسائٹی و دیگر ادبی و ثقافتی ادارے شامل تھے۔ مصنف نے تحریر کیا ہے کہ مشرقی پاکستان کی عوام تعلیم کی جانب راغب تھی اور وہاں تعلیمی اوسط دن بہ دن بڑھ رہا تھا۔ مزید کئی نئے منصوبے جیسا کہ سٹیل مل، شکر کے کارخانے اور جوٹ مل زیر تکمیل تھی۔ صہبا لکھنوی نے یہ سفر ۱۵ جون ۱۹۶۱ء میں کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز شروع کیا تھا۔ اس سفر کے دوران ان کے ہمراہ مولانا رازق الخیری (مدیر عصمت کراچی)، شریف المجاہد (صدر شعبہ صحافت، کراچی یونیورسٹی)، قیوم ملک (مدیر انٹرپرائزز کراچی)، ذاکر علی (نمائندہ تعمیر، راولپنڈی) تھے۔ اس سفر میں طیارے نے کراچی سے پروان بھری اور طیارہ حیدرآباد سندھ، جودھپور، جے پور، گوالیار، الہ آباد، بنارس، گیا اور بہرام پور سے گزرتے ہوئے ڈھاکا پہنچا۔ مصنف کے اس سفر کو

ادارہ تعمیر نو اور محکمہ اطلاعات عامہ نے ادیبوں اور صحافیوں کے تبادلے کے پروگرام کے تحت مشترکہ طور پر ترتیب دیا تھا تاکہ مشرقی پاکستان کے حالات اور مسائل کا جائزہ لیا جاسکے۔

صہبا لکھنوی نے اپنے اس سفر نامے میں بنگال کی مختصر تاریخ بھی قلم بند کی ہے۔ مصنف کے نزدیک حصول آزادی میں بنگال کے نوجوانوں نے بہت سی قربانیاں دی تھیں۔ ان نوجوانوں کو آزادی کے لیے جدوجہد کا شعور ان کے آباواجداد سے ملا تھا جو کہ صوفیاؤں اور روحانی پیشواؤں کے عقیدت مند تھے۔ بنگال ہی وہ پہلا صوبہ تھا جس نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ اردو زبان کی بنگال میں تاریخی حیثیت کو لے کر صہبا لکھنوی تاریخ کے اوراق کو پلٹتے ہیں۔ آٹھارویں صدی میں جب اردو زبان ہندوستان کے دیگر علاقوں جیسا کہ دلی، لکھنؤ، حیدرآباد میں پروان چڑھ رہی تھی تب انگریزوں کے اقتدار کے بعد کلکتہ مرشد آباد اور ڈھاکا میں اردو زبان فروغ حاصل کر رہی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو کی نشو نما میں گراں قدر اضافہ ہوا اور یوں بنگلہ ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب بھی آگے بڑھا۔ ڈھاکا سے اردو کا پہلا رسالہ "المشرق" ۱۹۰۶ء میں حبیب حکیم الرحمن نے نکالا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ڈھاکا میں اردو ادب کی عصمت میں فرق نہ پڑا بلکہ ہندوستان کے کئی قد آور اور نامور ادیب ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آگئے اور انہوں نے اس خطے کو اپنا وطن بنا لیا۔ صہبا لکھنوی نے اپنے اس سفر نامے میں بیسیوں ادیبوں کے نام لکھوائے ہیں جو مشرقی پاکستان میں اردو زبان و ادب سے قریبی رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان اہم ناموں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، فضل احمد کریم فضلی، علامہ رضا علی وحشت، مبارک مونگیری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، عارف بلگرامی، آفتاب احمد صدیقی، حنیف فوق، یونس احمر، محمود اکبر آبادی عرش لکھنوی، نوشاد نوری، نظیر صدیقی، حلال صدیقی، عطاء الرحمن جمیل، اختر بیاری، وحید قیصر ندوی، اشتیاق احمد، شوق خورشید احمد، سید شمیم احمد، عبدالرحمن بے خود وغیرہ شامل ہیں خواتین اردو ادیبوں میں بیگم شائستہ اکرام اللہ، بیگم زینت نعمانی، بیگم لقمان حیدر، جہاں آرا چوہدری، مسز الطاف حسین ساجدہ فہمی، ماہ طلعت، شہناز عذرا، شیریں کرشمہ، نزہت سمیع، نجمہ سمیع، رشیدہ برھانی، ستارہ اکرام وغیرہ شامل ہیں۔

سانحہ مشرقی پاکستان کے پیچھے ایک اہم وجہ دونوں خطوں کے درمیان دوری تھی۔ صہبا لکھنوی بھی مشرقی پاکستان کی دوری کو لے کر مملکت کی کمزوری کو بیان کرتے ہیں۔

> "میں نے سوچا یہ فاصلے یہ دوری اگر حائل نہ ہوتی تو پاکستان کے یہ دونوں بازو کتنے طاقتور ہو سکتے تھے۔" (۶)

صہبا لکھنوی نے اپنے سفر کے دوران دونوں خطوں کے درمیان پائی جانے والی بدگمانی اور غیر وفاداری کا بھی ذکر کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ محض ایک غلط فہمی تھی جو کہ سیاست بازی کا نتیجہ تھی ورنہ مغربی و مشرقی پاکستان کے عوام خود کو دکھ درد میں ایک دوسرے کے شریک سمجھتے تھے۔ اپنے اس سفر کے دوران صہبا لکھنوی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مشرقی پاکستان کی عوام نے ان کا استقبال ہاتھوں ہاتھ کیا۔ مشرقی پاکستان میں جب وہ ایک غفار نامی گاؤں کے مقام پر پہنچے تو وہاں کی عوام کی محبت اور خلوص مصنف کے نزدیک دیدنی تھا، جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں۔

> ”ٹرین کی روانگی کے وقت جس محبت اور خلوص سے ہاتھ ہلا ہلا کر غفار گاؤں کے رہنے والوں نے ہمیں رخصت کیا یہی ہاتھ پاکستان کی اصلی طاقت ہیں اور جس جذبہ و محبت سے انہوں نے ہمیں گلدستے پیش کیے ہیں یہی جذبہ پاکستان کی تقدیر ہے۔ جس کے صحیح وارث یہی عوام ہیں۔ ان ہاتھوں کو، ان جذبات کو کبھی فنا نہیں۔ دوری اور فاصلے اور سیاسی ریشہ دانیاں بھی عوام کے ازلی رشتوں کو کبھی ختم نہیں کر سکتی۔“ (۷)

مشرقی پاکستان کے اس سفر میں مصنف اور ان کے ہمراہ ساتھیوں کو شاعر پریس کلب میں ایک پُر تکلف عصرانہ دیا گیا۔ اس پُر تکلف تقریب میں حاضرین نے مشرقی پاکستان کے حوالے سے اپنے تاثرات بیان کیے۔ مصنف نے دونوں خطوں میں ذہنی قربت اور ہم آہنگی کے لیے تجویز پیش کی کہ بنگلہ ادب کی بہترین تخلیقات اردو میں ترجمہ کی جائیں اور اسی طرح اردو کی منتخب کتابیں بنگلہ زبان میں منتقل کیے جائیں تاکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔ مزید مصنف نے تجویز پیش کی کہ مستحکم بنیادوں پر اردو اور بنگلہ زبان میں معیاری رسالے شائع ہوں۔ مزید اردو جاننے والے بنگالی اور بنگالی جاننے والے اردو زبان سیکھیں۔ صہبا لکھنوی نے بنگلہ اکیڈمی میں بھی ہونے والے جلسے کی کاروائی کو اپنے سفر نامہ میں بیان کیا ہے جس میں مختلف مندوبین نے دونوں خطوں کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کے لیے تجاویز پیش کیں۔ اس موقع پر صہبا لکھنوی نے مشرقی پاکستان کے مشہور دانشور ڈاکٹر شہید اللہ کے تاثرات اور فکر انگیز تجویز کو یوں بیان کیا۔

> ”مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندوں میں شادیوں کے رواج کو عام کیا جائے تاکہ دونوں بازوں کے رشتے مزید مستحکم ہو سکیں۔ آپ نے فرمایا کہ اسلام نے اتحاد و اُخوت کا جو درس دیا ہے اس کی طاقت سے انکار ممکن نہیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے جذباتی انداز میں

فرمایا: "میں کہتا ہوں دونوں بازوں میں شادی بیاہ کے رشتے اس طرح قائم کرو کہ دونوں جگہ کا خون ایک ہو جائے۔" (۸)

صہبا لکھنوی اپنے اس سفر کے دوران مشرقی پاکستان کے بہت سے مقامات جیسا کہ نارائن گنج، سلہٹ، جیسور، کھلنا، سندر بن، باریسال، چاندپور، میمن سنگھ، چٹاگام اور ڈھاکہ کا دورہ کیا تھا اور ان مختلف علاقوں میں ہونے والی صنعتی اور زرعی ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مزید ان علاقوں میں عوام کی فلاح و بہبود اور بہتر طرز زندگی کی خاطر شروع کیے گئے کئی حکومتی منصوبوں کا معائنہ بھی کیا تھا۔ سب سے پہلے وہ ڈھاکہ سے نارائن گنج پہنچے جس کا فاصلہ ڈھاکہ سے ۱۲ میل ہے۔ مصنف نے بیان کیا ہے کہ اس علاقے کی پہچان جوٹ کی مصنوعات کی تیاری ہے۔ جوٹ سے بننے والی اشیاء کا ۵۰ فیصد حصہ صرف نارائن گنج کی ملوں سے تیار ہوتا ہے۔ نارائن گنج میں جوٹ مل کی پیداوار کے متعلق صہبا لکھنوی یوں بیان کرتے ہیں:

"ہمیں یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا جوٹ مل ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس مل پر ۱۰ کروڑ سے زائد کا خرچہ آیا ہے۔ مل کی تعمیر ۱۹۵۰ء میں شروع ہوئی جس کی تکمیل ۱۹۵۵ء میں ہوئی اور اس مل میں ایک ارب ۲۰ کروڑ گز ٹاٹ چھ، کروڑ بوریاں روزانہ------اور جوٹ کا سامان روزانہ تیار ہوتا ہے یہ ملک ۳۰ ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور ایک وقت میں بیس، بائیس ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ مزدوروں کی رہائش، طعام آسائش کا مل کے اندر ہی مکمل انتظام ہے۔" (۹)

نارائن گنج کے بعد مصنف اور ان کے ساتھیوں نے سلہٹ کا دورہ کیا۔ سلہٹ کا فاصلہ ڈھاکہ سے ۱۹۸ میل ہے۔ سلہٹ کا مقام چائے کے باغات کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔ جب مصنف نے مشرقی پاکستان کا سفر کیا تو یہاں ۱۲۱ چائے کے باغات تھے۔ جن میں "ڈنکن برادرز" کے چائے کا باغ ۲۵ میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اور تمام چائے کا علاقہ ۷۵ ہزار میل رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۶۱ء تک یہاں کے ۶۰ء فیصد باغات پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ سلہٹ کا علاقہ دریائے آسام کے کنارے واقعہ ہے۔ یہاں پر تجارت دریائی راستے سے ہوتی تھی۔ چائے کے باغات کے علاوہ یہ علاقہ قیمتی جنگلات، انناس، بانس، چھالیہ، تیزپات کی مصنوعات پیدا کرتا تھا۔ مزید دریائی علاقے میں ماہی گیر اپنی روزی کماتے تھے۔ سلہٹ کے بعد صہبا لکھنوی اور ان کے ساتھی جیسور اور کھلنا کے مقام پر گئے۔ ڈھاکہ سے جیسور کا فاصلہ ڈیڑھ سو میل ہے۔ اس مقام پر دریائے بھیرب کے کنارے کھلنا نیوز پرنٹ مل ہے۔ مصنف اور ان کے ساتھیوں نے کھلنا نیوز پرنٹ

مل میں کاغذ کی تیاری کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس مل میں دو مشینیں تھیں جو روزانہ ۱۶۰ ٹن کاغذ تیار کرتی تھیں۔ یہ مل ۱۹۵۴ء میں تیار ہوئی۔ ابتدا میں اس کی پیداوار ۷۹ ٹن تھی اور ۱۹۶۱ء تک اس کی پیداوار سالانہ ۷۵ ہزار ٹن ہو گئی تھی۔ مصنف نے کھلنا کے مقام پہ ہی چھوٹے سمندری جہاز، لانچیں اور سٹیمر بنانے کا کارخانہ، "شپ یارڈ" بھی دیکھا۔ کھلنا ایک صنعتی شہر ہے جس میں ہونے والی صنعتی ترقی کو مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

> "کھلنا ایک صنعتی شہر کی حیثیت سے روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ اس کی آبادی ۴۰ ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ سے زائد ہو گئی ہے۔ کھلنا نیوز پرنٹ، کھلنا شپ یارڈ، جوٹ ملز، میچ فیکٹریاں اور ناریل کی صنعتیں ضلع بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جگہ جگہ تعمیراتی کام دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ مستقبل قریب میں اس شہر کی اہمیت بڑھ جائے گی۔"(۱۰)

کھلنا کے قریب ہی سندر بن کے جنگلات ہیں۔ سندر بن کے جنگلات قریباً چار ہزار مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان جنگلات کا نصف سے زائد حصہ مشرقی پاکستان میں ہے اور بقیہ حصہ بھارت میں آتا ہے۔ سندر بن کی وائلڈ لائف کے متعلق مصنف نے تحریر کیا ہے کہ یہاں دنیا کا مشہور بنگال ٹائیگر رہتا ہے۔ اس جنگل میں زہریلے سانپ، خطرناک بندر، مگرمچھ، ازدھے، تیندوے اور بھیڑیے بستے ہیں۔ سندر بن کے ان جنگلات سے شہد اور گیوہ لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ گیوہ لکڑی سے نیوز پرنٹ کے علاوہ دیا سلائی بنائی جاتی ہے۔ سندر بن کے جنگلات دیکھنے کے بعد مصنف اور ان کے ساتھیوں نے چند دیہاتی مراکز کا دورہ کیا اور انہیں وہاں کی طرز زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان مقامات میں باریسال، غفار گاؤں شامل ہیں۔ دیہاتی مراکز کا دورہ کرنے کے بعد مصنف کی ٹیم چٹاگام پہنچی۔ کراچی کے بعد چٹاگام ہی پاکستان کا سب سے بڑا بندرگاہ تھا۔ اس شہر کو اولیاء کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں بہت سے اولیا کرام کے مزارات اور تاریخی مساجد موجود ہیں۔ قائداعظم نے اس شہر کو "مشرق کی رانی" کہا تھا۔ چٹاگام میں بنگالی، اردو، انگریزی عام بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی بنگلہ زبان ڈھاکا کی بنگلہ زبان سے اس طور مختلف ہے کہ یہاں کی بنگلہ زبان میں عربی زبان کے الفاظ زیادہ ہیں۔ چٹاگام کی اہمیت کو قلم بند کرتے ہوئے صہبا لکھنوی لکھتے ہیں :

> "آزادی کے بعد چٹاگام ایک مصروف ترین بندرگاہ بن گیا ہے۔ یہاں جہازوں کی ہر وقت آمد و رفت رہتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس بندرگاہ سے روزانہ ۳۰۰ لاکھ

ٹن سے زائد سامان کے باربرداری ہوتی ہے۔ بندرگاہ کی وہ نقل وحمل کی مزید سہولتوں کے لیے حکومت سرگرم کار ہے۔" (۱۱)

صہبا لکھنوی نے چٹاگام میں کرنافلی کے مقام پر کپتائی کا عظیم منصوبہ بھی دیکھا۔ کرنافلی میں آنے والے سیلابوں کے سدباب کے لیے دریا پر بند باندھا گیا تھا۔ اس بند سے جو پانی حاصل ہوتا تھا وہ کھیتی باڑی اور بجلی بنانے کے کام آتا تھا۔ مصنف کے بقول اس منصوبے سے ایک لاکھ بیس ہزار کلوواٹ بجلی پیدا ہو سکے گی۔ یہ منصوبہ ۱۹۵۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور امریکی حکومت اور انجینیئروں کے تعاون سے ۱۹۶۱ء میں مکمل ہوا۔ چٹاگام میں ہی مصنف اور ان کے ساتھیوں نے مشہور تفریحی مقام کاکس بازار بھی دیکھا۔ کاکس بازار ایک ساحلی مقام ہے اور ۷۰ میل لمبا پھیلا ہوا ہے۔ چٹاگام میں کرنافلی کے مقام پر مصنف اور ان کے ساتھیوں نے کرنافلی پیپر مل کا دورہ بھی کیا۔ اس مل میں ۱۰۰ ٹن کاغذ روزانہ تیار ہوتا تھا۔

آخر میں مصنف اور ان کے ساتھیوں نے ڈھاکا شہر کی مختلف مارکیٹوں کا دورہ کیا اور یہاں ڈھاکا کے علاوہ راج شاہی کی تیار کردہ ساڑھیاں بھی دیکھیں۔ مصنف کے بقول پورے مشرقی پاکستان میں صرف ڈھاکا اور چٹاگام ہی بڑے شہروں کی طرح تھے جو ادب صحافت اور تہذیبی سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ قیام پاکستان کے وقت ڈھاکا کی آبادی ایک لاکھ تھی جو ۱۵ سالوں کے اندر ۱۰ گنا بڑھ چکی تھی۔ ڈھاکا میں بنگال اکیڈمی، بلبل اکیڈمی، رائٹرز گلڈ، انسٹیٹیوٹ اف آرٹس، ریڈیو پاکستان، یونیورسٹی اور انگنت تاریخی عمارات، مساجد، کالجز، سکول اور دینی مدرسے قائم تھے۔

مصنف کے بقول مشرقی پاکستان میں سیلاب اور طوفان یہاں کی عوام کے لیے قیامت بن کے آتے تھے۔ جس سے کھڑی فصلیں، باغات اور مویشیوں کا نقصان ہوتا تھا لیکن مشرقی پاکستان کے عوام جفا کش تھے۔ ایسی تباہی کے بعد یہ لوگ نئے عزم کے ساتھ نئی بستیوں کو بسانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں ہر طرف نالے، دریا اور جھیلیں ہیں جو ایک طرف اس خطے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں تو دوسری طرف اس خطے کی معیشت کی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی ضرورتیں محدود، زندگی سادہ اور معصوم تھی۔ یہاں کے لوگ نیک نفس، خداترس اور مہمان نواز تھے۔ عوام غربت اور جہالت ہونے کے باوجود باشعور تھے۔ مصنف اور ان کے ساتھیوں نے مشرقی پاکستان کے کئی شہروں، دیہاتوں اور قصبات کا دورہ کیا تھا چنانچہ انہیں یہاں کے لوگوں کی طرز زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ عوام کی افلاس زدہ اور سادگی پسند زندگی کے متعلق مصنف نے یوں لکھا:

"تقریباً سبھی جگہ مرد اور عورتیں افلاس اور غربت کے باوجود ہمیں سادگی پسند، نیک نفس اور جفاکش نظر آئے۔ یہاں کے لوگوں میں عام طور پر مذہبی رجحانات اور حب الوطنی کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ دوران گفتگو ہمیں اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ عام تعلیم نہ ہونے کے باوجود یہاں کی عوام نہایت باشعور ہے۔ ملک اور ملک کے مسائل سے انہیں کماحقہ واقفیت ہے۔" (۱۲)

مصنف نے جہاں مشرقی پاکستان کی عوام کی غربت اور مفلوک حالی کو بیان کیا ہے وہاں عوام کی خوشحالی کے لیے صنعتی ترقی سے زیادہ زرعی ترقی کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ مصنف نے چاول اور پٹ سن کے علاوہ مویشی، دودھ، گھی، پھل، سبزیوں وغیرہ کی وافر پیداوار کے لیے زور دیا ہے تاکہ عوام کا میعارِ زندگی بلند ہو سکے کیونکہ عوام دودھ اور سبزی کا کم استعمال کرتے ہیں لہذا ان کی صحت کا معیار اچھا نہیں۔ غربت اور افلاس کے خاتمے کے لیے مصنف نے اپنے سفر نامے میں گھریلو مصنوعات کے فروغ کی تجویز بھی پیش کی ہے۔

صہبا لکھنوی نے اپنے سفر نامے "میرے میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان" میں ڈھاکا میں موجود چند قدیم ترین عمارتوں کو بھی دیکھا۔ یہ قدیم عمارتیں زمانہ بعید میں ڈھاکا کے شاندار ماضی کی گواہی دیتی ہیں۔ ڈھاکا میں انہوں نے قلعہ لال باغ، جسے سترھویں صدی میں اورنگزیب کے بیٹے شہزادہ محمد اعظم نے تعمیر کرایا تھا، دیکھا۔ اس کے علاوہ چوک مسجد، حسینی دلان کا امام باڑا، جسے سید مراد نے تعمیر کرایا تھا، اُس کو بھی دیکھا۔ مصنف کے بقول ڈھاکا شہر میں بہت سی مساجد اور ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں کی عبادت گاہیں اور یادگاریں بھی تاریخی حیثیت رکھتی تھیں۔

صہبا لکھنوی کے نزدیک مشرقی پاکستان فنون لطیفہ کا گہوارہ ہے۔ یہاں ہر عمر کا فرد فنون لطیفہ میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ اپنے قیام میں مشرقی پاکستان میں مصنف نے انسٹیٹیوٹ اف ارٹس کا دورہ بھی کیا جسے مشہور مصور زین العابدین نے ۱۹۴۸ء میں قائم کیا تھا۔ اس انسٹیٹیوٹ میں آرٹ میں دلچسپی رکھنے والے طلبہ کو آرٹ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انسٹیٹیوٹ میں مصنف نے بچوں کی بنائی ہوئی بہت سی تصاویر کو دیکھا۔ ڈھاکا شہر ایک قدیم شہر ہے جہاں سے بہت سے معیاری ہفتہ وار اور ماہنامہ معیاری رسالے شائع ہوتے تھے۔ مصنف کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ صحافت کے میدان میں مشرقی پاکستان میں محض دو شہر ڈھاکا اور چٹاگام ہی آگے تھے دیگر شہر جیسا کہ سلہٹ، میمن سنگھ، کھلنا اور جیسور وغیرہ میں اچھے اور معیاری رسالے دستیاب نہ تھے۔

اس سفر کے دوران صہبا لکھنوی نے بنگلہ اکیڈمی کا بھی دورہ کیا جسے ۱۹۵۵ء میں حکومت نے قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد بنگلہ زبان کو ایک قومی زبان کی حیثیت سے ترقی دینا تھا۔ مصنف نے اکیڈمی میں لغات کی تیاری اور نایاب کتب کی اشاعت کا کام دیکھا۔ مصنف نے اپنے قیامِ مشرقی پاکستان میں یہاں کے لوگوں کی بود وباش کو قریب سے دیکھا۔ مصنف نے اس حوالے سے تحریر کیا کہ مشرقی پاکستان میں بڑی حد تک پردے کا رواج تھا تاہم بے پردہ خواتین بھی سادگی پسند تھیں ۔ یہاں اردو زبان زیادہ سمجھی جاتی تھی لیکن زیادہ بنگلہ زبان بولی جاتی تھی۔ آبادی کا بڑا حصہ چاول، مچھلی اور نمک پر قناعت کرتا تھا۔ مرد حضرات تہمند اور بنیان جبکہ عورتیں ساڑھی استعمال کرتی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں آٹھ مہینے بارشوں کا سلسلہ چلتا تھالہٰذا چھتری کا استعمال عام تھا۔ اس خطے میں بھوک غربت اور افلاس کا مسئلہ سیلابوں اور طوفانوں سے جڑا ہوا تھا۔ تاہم یہاں کی عوام مشکلات کا مقابلہ بہادری سے کرتی تھی جیسا کہ صہبا لکھنوی اپنے اس سفر نامے میں بیان کیا:

> "مجموعی حیثیت سے مشرقی پاکستان کے عوام بڑے جیالے حوصلہ مند اور بہادر ہیں۔ ناگہانی آفات، صبر آزما حالات اور مشکلات کا بڑی جی داری سے مقابلہ کرتے ہیں اور خدا کو ۔۔۔اس عظیم طاقت کو نہیں بھولتے جس کے قبضہ اختیار میں موت اور زندگی ہے۔ موت بلا شبہ نہایت بے رحم ہے اور زندگی بہت حسین۔ تعلیم، صحت، روزگار، بھوک، غربت وافلاس، سیلاب، طوفان اور آبادی میں مسلسل اضافہ اس خطہ ملک کے عظیم نہایت اور توجہ طلب مسئلے ہیں اور ان کی جلد از جلد تکمیل پر ہی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے عوام کی آسودگی، خوشحالی، فارغ البالی اور ہمہ گیر ترقی کا انحصار ہے۔" (۱۳)

صہبا لکھنوی نے اپنے سفر نامے کا آغاز نذرالاسلام کی نظم سے کیا ہے اور اس سفر نامے کا اختتام بھی قاضی نذر الاسلام کی نظم سے ہی کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی نذرالاسلام جس طرح اپنے وطن اور روایات سے محبت رکھتے ہیں اس کو صہبا لکھنوی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ قاضی نذرالاسلام کو مشرقی پاکستان میں رہنے والے لوگوں کے جذبات کا حقیقی ترجمان خیال کرتے ہیں ۔ صہبا لکھنوی قاضی نذرالاسلام کو ان الفاظ میں ٹربیوٹ پیش کرتے ہیں :

> "خصوصیت کے ساتھ بنگلہ میں اسلامی ادب اور عربی اور فارسی کے ان گنت الفاظ کو رواج دینے میں کیقباد، مشرف حسین اور قاضی نذرالاسلام سرفہرست ہیں۔ نذر الاسلام نے بنگلہ

میں عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ کو جس دریادلی اور وسعت قلبی کے ساتھ استعمال کر کے اسے سنسکرتی اثرات سے پاک کیا ہے اسے بنگلہ زبان و ادب کی تاریخ میں سبز حروف سے لکھا جائے گا۔" (۱۴)

قاضی نذرالاسلام کے اس اقدام یعنی بنگلہ زبان میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کے استعمال پر قدامت پرستوں نے مخالفت کی لیکن قاضی نذرالاسلام کی کوششوں سے بنگلہ شاعری میں مشرقی پاکستان میں فارسی اور عربی اوزان و بحور کا آزادانہ استعمال ہوا۔

"لکشمن ریکھا کے پار" الیاس احمد گدی کا مشرقی پاکستان سے متعلق سفر نامہ ہے۔ یہ سفر انہوں نے ۱۹۶۸ء میں کیا تھا اور ان کے اس سفر کے محض تین سال بعد مشرقی پاکستان ایک نئے ملک بنگلہ دیش کی صورت میں نقشے پر اُبھرا تھا۔ الیاس احمد گدی کے سفر نامے کی اگرچہ پہلی اشاعت ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آئی تاہم یہ سفر نامہ الہ آباد سے شائع ہونے والے رسالہ "شب وخون" میں قسط وار شائع ہوتا رہا تھا۔ اس سفر نامے کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں ان حالات و واقعات کو مصنف نے قلم بند کیا ہے جو بعد میں خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن کی وجہ سے عالمی منظر نامے پر بنگلہ دیش اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ الیاس احمد گدی کا یہ سفر ایک مہینے کا ہے اور انہوں نے مشرقی پاکستان کا یہ سفر صہبا لکھنوی کے سفر نامے " میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان" سے متاثر ہو کر کیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے کہ حقیقت میں واقعی مشرقی پاکستان کی سرزمین ایک "خوابوں کی سرزمین" ہے یا ان مظلوم لوگوں کی سرزمین ہے جس میں قرۃ العین حیدر کے ابو المنصور جب دریا میں کشتی چلاتے تھے تو ان کی پیٹھ پر انگریز آقا بید رسید کرتا تھا کہ کشتی کو تیز چلائے اور ابو المنصور انگریز کے اس ظلم کو سہہ جاتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آج بھی وہاں کا ابو المنصور ایسا ہی ہے یا اس میں تبدیلی آگئی ہے۔ اس سفر نامے کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے محمد علام الدین " لکشمن ریکھا کے پار ایک مطالعہ "میں اس سفر نامے کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"گرچہ یہ سفر بامشکل ایک مہینے کا ہے مگر اس ایک مہینے کے جو دلدوز واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ شاید ہی کسی تاریخ کی کتابوں میں ملیں۔ سفر نامے کو پڑھتے ہوئے بار بار الیاس احمد گدی کے ذریعے کھینچا گیا نقشہ نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس ایک مہینے میں ہم صدیوں کا سفر کر کے وہاں کی ہر چیز میں رچ بس گئے ہیں۔ "(۱۵)

سفر نامہ "لکشمن ریکھا کے پار" بنگال کی تہذیب و ثقافت اس کے شاندار ماضی، عوام کی مخلصی اور بہاری کمیونٹی کی شناخت کے مسئلے، بنگالیوں کے استحصال ان کی تہذیب و ثقافت اور بنگالی زبان کو کم اہمیت دینا، مہاجرین اور بنگالیوں کے مابین غلط فہمیوں نفرتوں کی وجوہات کو بیان کرتا ہے۔ الیاس احمد گدی اپنے اس سفر نامے میں زیادہ تر مشرقی پاکستان کی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہیں اور اس کی بدحالی کی تاریخ پر مکمل نگاہ رکھتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے اس سفر کے دوران وہ بار بار مشرقی پاکستان کی تاریخ کو یاد کرنے لگتے ہیں جس میں اس خطے کے لوگوں سے ماضی میں بھی ظلم و ستم ہی روا رکھا گیا۔ بنگال کی تاریخی صورتحال کو وہ یوں قلم بند کرتے ہیں:

> "یہ بنگال تھا۔ وہ بنگال جس کے متعلق ایڈ میرل وائسن نے سراج الدولہ سے کہا تھا میں تمہارے ملک میں ایسی آگ لگاؤں گا، ایسی آگ لگاؤں گا جسے سات دریاؤں کا پانی بھی نہ بجھا سکے گا اور واقعی ہی اس نے ایسی آگ لگائی جس نے چھوٹے بڑے زمینداروں کو راجہ کے خطاب سے نوازا اور مارواڑیوں کے ہاتھوں میں سرمایہ داری کی مشعلیں تھما کر ان کے ساتھ کر دیا۔ ان مارواڑیوں اور راجاؤں نے اپنے آقاؤں کے اشارے پر ایسی آگ لگائی کہ سارا بنگال جل کر راکھ ہو گیا۔ " (۱۶)

ماضی میں بنگالیوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا وہ یہاں کی قوم کو مٹا نہ سکا۔ یہاں کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہر طرح کی ظلم و زیادتی کے باوجود بنگال زندہ رہا۔ مزید قدرت بھی بنگالیوں پر مہربان رہی کہ اس نے اس خطے میں بارشیں برسائیں اور زمین کو زرخیز بنایا جس سے بنگال آتش کدہ کی بجائے ایک سرسبز شاداب گلشن کی مانند نظر آتا ہے۔ سفر کے دوران جب الیاس احمد گدی کو مرشد آباد کا سنگ میل دکھائی دیا تو وہ پھر ماضی کی جھروکوں میں جا پہنچے۔ انہیں مرشد آباد علی وردی خان کی سلطنت کی صورت میں نظر آرہا تھا۔ علی وردی خان جو یہاں آکر یہاں کے ہی ہو گئے۔ تب ان کے تعلقات افغانستان اور دلی سے منقطع ہو گئے۔ علی وردی خان کو شکست دینے والے انگریز تھے اور ان کی حکومت جانے کے بعد انگریزوں نے اس خطے کا خوب استحصال کیا۔ الیاس احمد گدی جب ڈھاکہ پہنچے تو ڈھاکا کی بربادی جو مختلف ادوار میں ہوتی رہی اس کی پوری داستان ان کے باطن میں سمٹ آئی وہ سوچ میں پڑ گئے کہ وہ کون سا ڈھاکا اپنی نظروں سے دیکھنے والے ہیں۔

"وہ ڈھاکا جو پال بادشاہوں کا پر شکوہ ڈھاکہ تھا یا سین راجاؤں کا امیر ترین ڈھاکا تھا یا وہ ڈھاکا تھا جس کے جلاہے پارچہ بازی کی صنعت کو ترقی دینے والے تھے کہ ململ کا پورا تھان ایک چھلے سے گزر جاتا تھا۔" (۱۷)

تاریخ کے حوالے سے مصنف کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ اسی وجہ سے جب وہ ماضی سے حال کی طرف لوٹتے ہیں اور تاریخی حقائق کے مطابق اشیا کو دیکھتے ہیں تو ان کے دل و دماغ پر ایک اداسی پیدا ہو جاتی ہے۔ قاری ایک لمحے میں متعلقہ مقام کی تاریخ سے بھی واقف ہو جاتا ہے اور مصنف کی اس بے چینی کو بھی محسوس کر لیتا ہے جو اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوتی ہے۔

الیاس احمد گدی نے اپنے اس سفر میں مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں کو دیکھا تھا۔ انہیں مشرقی پاکستان میں رہنے والے لوگوں کی سماجی و معاشی صورتحال یکساں دکھائی نہیں دی۔ کہیں تو انہوں نے بنگالی کسانوں کو صحت مند اور تندرست و توانہ پایا اور کہیں غربت اور مفلسی کا اس قدر شکار پایا کہ ان کے نحیف جسم ان کی کمزوری کی چغلی کھا رہے تھے۔ نواب گنج میں ان کا گزر ہوا تو وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر جیسا انہوں نے محسوس کیا اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اب دن نکل آیا ہے اور لوگ بوگ اپنے کام کاج میں لگ گئے ہیں میں نے پہلی بار مشرقی پاکستان کے لوگوں کو دیکھا یہ زیادہ تر کسان تھے ناٹا قد مگر بے حد تندرست۔ خاص طور سے بازو بے حد گٹھے ہوئے، شانے چوڑے اور بے حد پھرتیلے۔ ہمارے یہاں کے بنگالی دبلے پتلے مگر بے حد ذہین اور مہذب دکھائی دیتے ہیں جبکہ یہ لوگ ہٹے کٹے اور محنتی دکھلائی دیتے ہیں۔" (۱۸)

الیاس احمد گدی جب ڈھاکا میں بنگالیوں کے مخصوص علاقے کا دورہ کرتے ہیں تو وہاں کی کسمپرسی، غربت اور مفلسی نے ان کو حیران کر دیا۔ بنگالیوں کی چھوٹی مارکیٹ میں جب وہ داخل ہوئے تو بہت سے لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے دکاندار میلی بنیانوں، چارخانے والی سستی لنگیوں، دھول گرد میں اٹے بدن، افلاس اور آنکھوں سے ناچتی بھوک ان کو نظر آئی اور وہ سوچ میں پڑ گئے کیا یہ وہی تاریخی مقام ہے جو کبھی راجاؤں کا دارالخلافہ تھا یہاں کی غربت اور مفلسی کو بیان کرتے ہوئے خود مصنف بھی حیرت زدہ ہے:

"میں حیرت زدہ کھڑا سوچتا رہا کہ یا خدا یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا یہ وہی مقام ہے جو کبھی پال اور یسین راجاؤں کا دارالخلافہ تھا؟ کیا اس دریا میں میور پنکھی چلا کرتے تھے اور خوبصورت بڑی بڑی انکھوں والی مرگ نینی لڑکیوں کے غول کے غول غریب لباس سے اپنا ملی حسن

جھلکاتی کیا ان ہی سڑکوں پر چہلیں کرتی پھرتی تھیں اور سہاگنیں مانگ میں سیندور رچائے
آنچل میں چابی کا گچھا باندھے داسوں کے ساتھ کیا اس بازار میں خرید و فروخت کے لیے آیا
کرتی تھیں یہ تو بالکل الگ جگہ ہے ایک دوسرا ہی علاقہ ہے بڑا غریب خستہ حال۔" (۱۹)

الیاس احمد گدی نے اپنے سفر نامے میں ڈھاکا شہر میں بہت سے غربت کے مظاہرے دیکھے مصنف کے بقول مشرقی پاکستان میں دنیا کا بہترین خوشبو دار اور ذائقہ دار چاول پیدا ہوتا ہے جو کہ اری چاول کہلاتا ہے لیکن یہ چاول بنگلہ دیش کے مقامی لوگوں کو کھانا نصیب نہیں ہے یہ چاول چین کو برآمد کر دیا جاتا ہے اور اس کے بدلے میں سونا چاول درآمد کیا جاتا ہے جو کہ کھانے میں نہ تو ذائقہ دار ہے اور نہ ہی خوشبو دار لیکن سستا ہونے کی بنا پر مشرقی پاکستان کی کثیر آبادی کی خوراک کا مسئلہ حل کرتا ہے۔ مزید انہوں نے ڈھاکا شہر میں بہت سے ایسے بینک دیکھے جو کثرت سے قرض دیتے تھے اور دھڑلے سے سود وصول کرتے تھے۔ تاہم ڈھاکا کے بعد وہ کھلنا کے ایک مضافاتی علاقے جیسر میں جاتے ہیں تو وہاں بنگالیوں کی حالت قدر بہتر تھی۔ اس علاقے میں کسی قسم کا تعصب موجود نہ تھا اس علاقے کا زیادہ تر انتظام بہاریوں کے ہاتھ میں تھا اور لوگ خوشحال تھے۔ جیسر میں خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ مصنف کے چچا نے انہیں دعوت دی کہ وہ بھی ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آجائیں لیکن مصنف نے ان کی دعوت کو نظر انداز کر دیا۔

اس سفر کے دوران مصنف نے بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان پائے جانے والی نفرت اور تعصب کو کھل کر بیان کیا ہے۔ مشرقی پاکستان بننے کے بعد بہاری بطور مہاجرین کے مشرقی پاکستان کا رخ کرنے لگے۔ بنگالیوں نے ابتدا میں بہاریوں کو خوش آمدید کہا اور ان میں مدغم ہونا چاہا۔ لٹے ہوئے برباد تباہ حال مہاجرین جب مشرقی پاکستان کی سرحد پار کرتے تو بنگالی ان کے استقبال کو کھڑے ہوتے۔ بنگالیوں نے اپنے مہاجر بھائیوں کو مشرقی پاکستان میں آباد ہونے کے لیے ہر ممکن تعاون کیا اور اپنی لڑکیوں کی شادیاں ان سے بیاہیں۔ بہاری چونکہ ہنر مند اور پڑھے لکھے تھے لہذا وہ یہاں کے کاروبار اور نوکریوں پر قابض ہو گئے اور انہیں یہاں کے غریب بنگالی کمتر درجہ کے انسان نظر آنے لگے۔ بہاریوں نے یہاں پاؤں جمانے کے بعد اپنی منکوحہ اور چھوڑی ہوئی عورتوں کو بلانا شروع کر دیا اور تیزی سے یہاں کی بنگالی لڑکیوں کو طلاقیں دینا شروع کر دیں۔ مزید بہاری مغربی پاکستان کو اپنا نجات دہندہ اور محافظ تصور کرتے تھے۔

مصنف کے بقول ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان پر بھارت نے حملہ نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود بہاری بار بار ایوب خان کے اس نعرے کو دہراتے تھے کہ "تم نے کس قوم کو للکارا ہے" لیکن خود

بنگالی نہ تو جنگ میں دلچسپی رکھتے تھے اور نہ ہی فوج کی شان میں قصیدے پڑھتے تھے۔ بنگالی سمجھ گئے تھے کہ مغربی پاکستان کے حکمران ان کے نجات دہندہ نہیں ہیں بلکہ ان کا محبوب لیڈر شیخ مجیب الرحمن ہے اور رفتہ رفتہ بنگالیوں نے بہاریوں سے شدید نفرت کرنا شروع کر دی اور انہیں اپنے وطن کا غاصب اور مغربی پاکستان کا ایجنٹ سمجھنا شروع کر دیا۔ الیاس احمد گدی نے جب بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان بد اعتمادی کی وجہ جاننی چاہی تو وہاں کے ایک مقامی شخص نے اس کی وجہ یوں بیان کی:

> "بات دراصل یہ ہے الیاس بھائی کہ یہ بنگالی جو ہیں نہ یہ کوفی ہیں۔ کوفی سمجھتے ہیں نا اپ یعنی کوفہ کے رہنے والے جنہوں نے حسین کو خط لکھ کر بیت کے لیے بلوایا تھا اور خود پلٹ گئے ان کا بھی کچھ ٹھیک نہیں کب اور کہاں دھوکہ دیں گے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اسی لیے تو ایک بادشاہ نے بنگال کے دریا کو جب جوار بھاٹا میں الٹے بہتے دیکھا تو کہا کہ جس ملک کی ندیاں سیدھا بہتے بہتے الٹا بہنے لگتی ہیں وہاں کے آدمیوں کا کیا اعتبار۔ " (۲۰)

مشرقی پاکستان کے لوگوں کی خراب معاشی صورتحال اور بنگالیوں و بہاریوں میں پائی جانے والی نسلی منافرت و تعصب کو بیان کرنے کے بعد مصنف نے اردو زبان کے مسئلے کو اُجاگر کیا ہے۔ الیاس احمد گدی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ہائی، مڈل اور پرائمری سکولوں کی بہتات ہے۔ زیادہ تر بنگالی میڈیم یا پھر انگلش میڈیم سکول ہیں۔ اردو سکول نہ ہونے کے برابر تھے اور مزید یہاں کے لوگوں کو اردو سکول نہ ہونے کا غم بھی نہ تھا کیونکہ بڑے بڑے کاروباری اور عہدے داروں کے بچوں نے تعلیم کے لیے بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں جانا ہوتا ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں مصنف کو بنگلہ اور انگلش کتابوں کے علاوہ اردو کتابوں کی دکانیں نظر نہیں آئیں۔ اردو میں جو رسائل اور اخبارات شائع ہوتے تھے ان کی بھی گنتی کی کاپیاں دکانوں پر موجود ہوتی تھیں۔ مصنف نے ڈھاکا یونیورسٹی کا بھی دورہ کیا اور اس یونیورسٹی میں طلبا کے سیاسی شعور کو سراہا۔ ڈھاکا میں ان کی نگاہ شہید مینار پر پڑی تو انہیں یہ بھی کوئی تاریخی مقام لگا لیکن جلد ہی ان کو معلوم ہوا کہ یہ ان طالب علموں کی شہادت کی یادگار ہے، جنہوں نے بنگالیوں پر زبردستی اردو زبان تھوپنے پر احتجاج کیا تھا اور پولیس کی گولی سے شہید ہو گئے تھے۔ جب بھی سال میں وہ دن آتا ہے تو بنگالی شہید ڈے مناتے ہیں اور جلوس نکالتے ہیں۔ اس جلوس کی کاروائی کے متعلق مصنف یوں رقم طراز ہے:

"اس روز ان کا غم و غصہ اور جوش و خروش دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ اس دن یہاں کہیں اردو کی تحریر نظر آتی ہے تو اس پر سیاہی پھیر دی جاتی ہے بلکہ دکانوں کے سائن بورڈ بھی جو اردو رسم الخط میں مل جائیں تو اس کو بھی سیاہ کر دیا جاتا ہے۔ اس دن تمام بہاری اپنے علاقوں تک محدود رہتے ہیں اور شہر کا بیشتر کاروبار معطل ہو جاتا ہے۔" (۲۱)

مصنف نے اپنے سفر کے دوران اس چیز کا مشاہدہ کیا کہ بنگالی اپنی زبان اور ثقافت کے معاملے میں بہت زود حس ہیں۔ بنگالی لوگ مذہب کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی کہ اپنی تہذیب کو لیکن ان کا شعور انہیں باور کراتا ہے کہ ٹیگور کے گیت گانے سے آدمی مسلمان سے کافر نہیں ہو جاتا۔ الیاس احمد گدی نے ڈھاکا میں قیام کے دوران شیخ مجیب الرحمن کی سیاست اور اس کے اثر و رسوخ کو بہت قریب سے محسوس کیا اور جب اس کے ہمنوا سے بات کرتے ہوئے مصنف نے شیخ مجیب الرحمن کو "فیوڈل پروڈکٹ" (جاگیر دارانہ پیداوار) اور "پیٹی بورژوا" (روس زبان کا لفظ اشتراکیت پسند) قرار دیا تو غصے میں اسے خاموش رہنے کے لیے کہا گیا۔ مصنف نے اپنے سفر نامے میں ڈھاکا شہر میں محمد پور، میر پور، سید پور، نیو مارکیٹ، نیو کیپیٹل اور بیت المکرم کے علاقوں کے سیر کا احوال بیان کیا ہے۔ ڈھاکا کی سیر کے بعد مصنف وطن واپسی کا ارادہ کرتا ہے اور ڈھاکا سے جیسور کے مقام کا رخ کرتے ہوئے اپنے وطن ہندوستان لوٹ جاتا ہے۔ وطن واپسی پر مصنف کے دل و دماغ پر ڈھاکا شہر میں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے حالات و واقعات طاری تھے۔ الیاس احمد گدی نے صہبا لکھنوی کے سفر نامے "میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان" سے متاثر ہو کر اور جس بنگال کے تصور کو لے کر مشرقی پاکستان کا سفر کیا تھا، وہ منظر ان کو مشرقی پاکستان میں نظر نہیں آیا اس صورتحال پر اپنی مایوسی کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

"یہ ایک ایسی دنیا تھی جس کے متعلق ان گنت قصے، کہانیاں اور واقعات سنتے تھے۔ جس کے متعلق ڈھیروں کتابیں پڑھی تھیں جو "سونار بنگلہ" تھا جو یسین اور پال راجاوں کا دیس تھا۔ جو رات راگنیوں کا ملک تھا۔ جس کی ہواؤں میں مرشدی اور چنڈی نغمے رچے تھے۔ جس کی گلی کوچوں میں، دیہاتوں میں، بنوں میں اور ندیوں پر نغموں کی پھوہار گر رہی تھی۔ اکتارے پر بادل گانے والے جوگیوں کی ٹولیاں اس گاؤں سے اس گاؤں، اس شہر سے اس شہر اس گھاٹ سے اس گھاٹ چلا کرتی تھیں اور بغیر بلاؤز صرف ساڑی میں لپٹی بڑی بڑی آنکھوں اور لمبے بالوں والی لڑکیاں پیتل کی گاگریں اٹھائے، تالابوں کے منڈیروں پر اترتی چڑھتی دکھائی دیتی تھیں مگر یہ سب کہاں تھا۔ کہاں تھا یہ سب۔" (۲۲)

صہبا لکھنوی نے اپنا سفر نامہ مشرقی پاکستان بنگال کے حسن سے متاثر ہو کر لکھا تھا اور مشرقی پاکستان کی سرزمین کو "خوابوں کی سرزمین" قرار دیا تھا جبکہ الیاس احمد گدی مشرقی پاکستان کا سفر کرنے سے قبل ہی تاریخ کے اوراق کے مطابق بنگال کا ایک تصور اپنے دل و دماغ پر ثبت کیے ہوئے تھے چنانچہ جب انہوں نے ایک سوچے ہوئے تصور کے مطابق بنگال کو نہ دیکھا تو مایوس ہو گئے۔ تشمیم شحمہ جنہوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے "الیاس احمد گدی حیات و خدمات" کے نام سے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا ہے، نے بھی ان کی ماضی پرستی کا ذکر کیا ہے :

> "الیاس احمد گدی کا مسلمانوں کے ماضی میں جھانکنا اور ماضی کی سیر ان کا محبوب مشغلہ ہے اور جب انہیں ماضی کے جھروکوں سے حال کی طرف لوٹنا پڑتا ہے تو ان کے دل و دماغ پر اداسی چھا جاتی ہے۔ جس کو ان کی تحریروں سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ حال کو ماضی سے جوڑتے ہوئے کف افسوس ملتے ہیں کہ نئی تہذیب نے ماضی کی قدیم اور اصلی شکل و صورت کو کتنا مسخ کر دیا ہے۔" (۲۳)

الیاس احمد گدی نے مرشد آباد، ڈھاکا اور کھلنا کے نواہی علاقے جیسر کے مقامات کو بھی دیکھا تھا اور انہیں وہاں کی معاشرت کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ تاہم وہ مشرقی پاکستان کے دیگر ترقی یافتہ علاقے جیسا کہ چٹاگام کی بندر گاہ، کاکس بازار، سلہٹ کے چائے کے باغات، کھلنا میں نیوز پرنٹ، نارائن گنج میں جوٹ مل، کپتائی کے مقام پر بجلی کی پیداوار کا منصوبہ ان کے نظروں سے اوجھل رہا۔ یہ وہ سارے ترقیاتی منصوبے تھے جو قیام پاکستان کے بعد محض ۲۰ سالوں کے اندر ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ جن سے عوام کا معیار زندگی روز بہ روز بہتر ہو رہا تھا۔ یہ منصوبے یقیناً مشرقی پاکستان کی عوام کی سماجی و معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ الیاس احمد گدی نے اس حوالے سے اپنے سفر نامے میں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ مزید وہ اپنے سفر نامے میں بنگالیوں اور مہاجر بہاریوں کے درمیان پائی جانے والی نسلی منافرت کا ذکر کرتے ہیں۔ اس نسلی منافرت کا ذکر صہبا لکھنوی اپنے سفر نامے میں بالخصوص نہیں کرتے۔ صہبا لکھنوی جنھوں نے مشرقی پاکستان کا سفر ۱۹۶۱ء میں کیا تھا، سمجھتے ہیں کہ اس وقت تک عوام میں پائی جانے والی نسلی منافرت اور تعصب کا ذکر محض سیاسی حلقوں میں تھا عوام میں نفرت کی بیج پیدا نہیں ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان صنعتی اور زرعی میدان میں خوب ترقی کر رہا تھا اور بنگالیوں اور غیر بنگالیوں و مغربی پاکستان کے عوام کے درمیان دوریاں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔

دونوں سفر ناموں کے تقابلی جائزے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرقی و مغربی عوام میں دوریاں بھارت نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک منصوبے کے تحت پیدا کی تھیں اور اس مقصد کے لیے قومی و بین الاقوامی سطح پر سیاسی و سفارتی ذرائع کا استعمال کیا تھا۔ اردو ادب میں دیگر اصناف کے مطالعے کے بعد بھی یہ بات عیاں ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ مغربی پاکستان سے کسی صورت الگ نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے لوگ محض اپنے خطے کے لیے خود مختاری کی حمایت کرتے تھے تاہم بھارت کی مداخلت اور عالمی سازشوں کے تناظر میں مشرقی پاکستان میں حالات ابتر ہوتے چلے گئے اور ملک میں خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو گئی اور اس کے بعد مشرقی پاکستان ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، (دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ۴۷۔

(۲) سیّد عبد اللہ، ادب و فن، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشر، ۱۹۷۷ء)، ۱۱۴۔

(۳) شبلی نعمانی، سفر نامہ روم مصر و شام، (اعظم گڑھ: دار المصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء)، ۶۔

(۴) قدسیہ قریشی، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، (لکھنو: نصرت پبلشر حیدری مارکیٹ، ۱۹۸۷ء)، ۲۴۔

(۵) خالد محمود، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء)، ۲۲۔

(۶) صہبا لکھنوی، میرے خوابوں کی سرزمین۔ مشرقی پاکستان، (کراچی: مکتبہ افکار، ۱۹۶۳ء)، ۲۲۔

(۷) ایضاً، ۱۰۳۔ (۸) ایضاً، ۱۸۷۔

(۹) ایضاً، ۴۴۔ (۱۰) ایضاً، ۸۳۔

(۱۱) ایضاً، ۱۳۲۔ (۱۲) ایضاً، ۱۲۳۔

(۱۳) ایضاً، ۲۰۰۔ (۱۴) ایضاً، ۱۸۵۔

(۱۵) محمد علام الدین، لکشمن ریکھا کے پار ایک مطالعہ، (دہلی: ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ۱۷۔

(۱۶) الیاس احمد گدی، لکشمن ریکھا کے پار، مرتبہ محمد علام الدین (دہلی: ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ۵۱۔

(۱۷) ایضاً، ۸۳۔ (۱۸) ایضاً، ۷۱۔

(۱۹) ایضاً، ۱۱۳۔ (۲۰) ایضاً، ۱۱۸۔

(۲۱) ایضاً، ۱۱۰۔ (۲۲) ایضاً، ۱۳۶۔

(۲۳) تسلیم شحمہ، الیاس احمد گدی: حیات و خدمات، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، (وارانسی: بنارس ہندو یونی ورسٹی، ۲۰۲۱ء)، ص ۲۰۴۔

References

1. Anwar Sadeed , Dr.,Urdu Adab me Safarnama, (Dehli : MR Publications, 2012), p 47.
2. Syed Abdullah , Adab o Fun , (Lahore: Sheikh Ghulam Ali and Sons Publishers,1977), p 114.
3. Shibli Nomaani, Safarnama Misar Room wa Sham, (Azam Gadh: Darul Musanfeen Shibli Accademy, 2010),p6.
4. Qudsia Qurashi, Urdu Safarnamay unesween sadi me, (Lakhnao: Nusrat Publisher Haideri Markeet, 1987),p24.
5. Khalid Mehmood , Urdu Safarnamay ka Tanqeedi Motalya, (Dehli: Educational Publishing House, 2017),p 22.
6. Sahba Luckhnowi, Meray Khawbon ki Sarzameen- Mashriqi Pakistan, (Karachi: Maktaba Afkaar , 1963), p22.
7. ibid., p 103.
8. ibid., p 187.
9. ibid., p 44.
10. ibid., p 83.
11. ibid., p 132.
12. ibid., p123.
13. ibid., p 200.
14. ibid., p 185.
15. Alaam u din , laxaman Reekha ke Par aik Motalya, (Dehli: Educational Publishing House, 2017), p 17.
16. Ilyas Ahmed Gaddi, laxaman Reekha ke Par , compiled by Alaam u Din (Dehli: Educational Publishing House, 2017), p 51.
17. ibid., p 83.
18. ibid., p 71.
19. ibid., p 113.
20. ibid., p 118.
21. ibid., p 110
22. ibid., p 136.
23. Tashmeem Shehma, Ilyas Ahmed Gaddi: Hayaat o Khidmaat, Unpublished PhD thesis (waransi: Banaras Hindu University, 2021), p 204.

❖❖❖